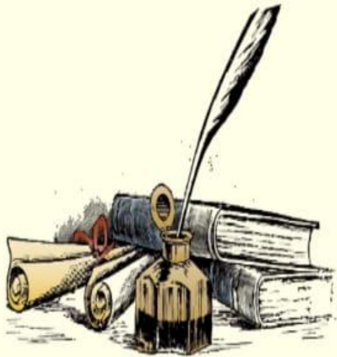
الاحسان اکیڈمی
بہرائچ

سلسلہ مطبوعات برقی اشاعت 9

چمنستان بہرائچ

(وطن پدری کو نثری و شعری خراج عقیدت)



از

پروفیسر طاہر محمود

سابق چیرمین قومی اقلیتی کمیشن



ناشر: الاحسان اکیڈمی بہرائچ

چمنستان بہرائچ

وطن پدری کو نثری اور شعری خراج عقیدت

پروفیسر طاہر محمود

ناشر
الاحسان اکیڈمی بہرائچ

سلسلہ برقی اشاعت الاحسان اکیڈمی بہرائچ ۹

کتاب:چمنستان بہرائچ(وطن پدری کو نثری اور شعری خراج عقیدت)
از: پروفیسر طاہر محمود
ترتیب: جنید احمد نور، بہرائچ
کور: وصی اللہ قاسمی بہرائچ
صفحات:٦٦
اشاعت: اکتوبر،۲۰۲۳ء
ناشر:الاحسان اکیڈمی بہرائچ

Chamanistan-e-Bahraich
Watan-e-Pidari ko Nasri aur Sheri Khiraj-e-Aqidat
By
Prof. Tahir Mahmood
Edition: October 2023
Pages: 66 Price: ₹
Setting: Juned Ahmad Noor, Bahraich
Cover: Wasi Ullah Qasmi, Bahraich
Publisher: Al-Ehsan Academy Bahraich

فہرست

پیش لفظ

صوبہ یوپی کے صدر مقام لکھنؤ سے تقریباً سوا سو کلو میٹر کی مسافت پر واقع شہر بہرائچ میرا ددھیالی وطن ہے۔ میری پیدائش تو ننھیالی وطن لکھنؤ میں ہوئی تھی لیکن بچپن کا زمانہ بہرائچ کے محلّہ قاضی پورہ میں واقع والد ماجد مرحوم و مغفور کی وسیع و عریض کوٹھی میں گزرا تھا۔

وقتاً فوقتاً میں نے بہرائچ اور وہاں کے احباب کے بارے میں مضامین لکھے ہیں اور وطن پدری کو کئی بار منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ میری ان سب تخلیقات کو اس مختصر رسالے میں یکجا کیا گیا ہے، اردو کے اس مشہور مقولے کے پیش نظر کہ "سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔"

طاہر محمود

سفر نامۂ بہرائچ

شمالی ہند کا بہرائچ نامی تاریخی شہر ریاست اتر پردیش کے صدر مقام لکھنؤ سے تقریباً سوا سو کلومیٹر دور ملک نیپال کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر سے یہ شہر میرے اسلاف پدری کا مسکن رہا ہے جب میرے پر دادا سید ہادی حسن مرحوم و مغفور ضلع رائے بریلی کے مردم خیز خطۂ جائس سے بہ سلسلۂ ملازمت وہاں جا بسے تھے۔ میرے دادا سیّد احمد حسن علیہ الرحمۃ اس شہر کے ایک نامور حکیم اور والد مرحوم جناب سید محمود حسن ضلع کے ایک ممتاز قانون داں اور ملّی رہنما تھے۔ میری والدہ محترمہ منور جہاں بیگم صوبائی حکومت میں ایک اعلٰی عہدے پر فائز اور لکھنؤ میں رہائش پذیر خان بہادر سید احسان عظیم مرحوم کی بیٹی تھیں۔ ان کے ایک ماموں مرادآباد کے مفتی محمد عطا مرحوم ضلع بہرائچ کی ریاست نانپارہ میں سرکاری افسر تھے اور میرے والدین انھیں کے توسط سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے۔ میری پیدائش لکھنؤ میں اپنے ننھیال میں ہوئی تھی اور میری عمر کا ایک غالب حصہ تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں بہرائچ سے دور دوسرے متعدد شہروں میں گزرا ہے۔ بہرائچ میں میرا قیام تو بہت کم رہا مگر آنا جانا ہوتا رہا، اور اسی مناسبت سے میں نے اس مضمون کا عنوان سفر نامۂ بہرائچ رکھا ہے۔

۱۹۲۷ء میں علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہوکر بہرائچ لوٹنے کے بعد میرے والد مرحوم محلّہ قاضی پورہ میں اپنے والدین اور بھائیوں کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔ چند سال بعد انھوں نے آبائی گھر کے قریب ہی ایک بڑا پلاٹ خرید کے اس پر ایک وسیع و عریض رہائشی عمارت کی تعمیر شروع کروائی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں ان کی شادی کے بعد والدہ مرحومہ کے مشورے سے اس کے نقشے میں کافی تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ اگلے سال جب عمارت کسی قدر مکمّل ہوئی تو انھوں نے اسکی پیشانی پر قرآن مجید کی آیت کریمہ کُلّ مَن عَلیھا فانِ ویبقی وَجہِ رَبّکَ ذُو الجلالِ وَالِاکرام کا کتبہ لگوایا تھا۔ عہد طفولیت میں جب مجھے لکھنؤ سے بہرائچ لے جایا گیا تھا تب شہر میں بجلی کا نظام نہیں تھا اور اس کوٹھی میں بھی روشنی مٹی کے تیل کے لیمپ اور لالٹین وغیرہ سے ہوتی تھی، بجلی کے قمقمے میرے ہوش سنبھالنے کے کافی بعد روشن ہوئے تھے اور لکھنؤ سے بلوائے گئے ایک الکٹریشین کا وہیں سے لائے گئے سازوسامان سے گھر کی چھتوں اور دیواروں کو بجلی کے پنکھوں اور لیمپوں سے مزین کرنا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پانی کے نل اس کے بھی بعد لگے تھے ورنہ پہلے تو صحن مین لگے ہینڈ پمپ اور بہشتی صاحبان کے کنوؤں سے بڑی بڑی مشکوں میں بھر کر لائے ہوئے پانی سے ہی کام چلتا تھا۔ میری ابتدائی تعلیم والدین کی آغوش شفقت میں اسی کوٹھی میں ہوئی تھی اور اس میں اردو، فارسی، عربی، انگریزی، قرآن و حدیث اور اردو نثر و نظم سبھی کچھ شامل تھا۔

اس کے بعد میں نے شہر کے متعدد اداروں میں پڑھائی کی جسکی شروعات مسعودیہ جناح ہائی اسکول سے ہوئی تھی۔ یہ اسکول والد ماجد مرحوم نے جو اس وقت ضلع مسلم لیگ کے صدر تھے بعض معززین شہر کی اعانت سے ایک قلعے نما عمارت میں قائم کیا تھا اور مقامی روایت کے مطابق شہر میں واقع درگاہ سیّد سالار مسعود غازی کی نسبت سے اس کے نام میں لفظ ''مسعودیہ'' بھی شامل کیا تھا۔ جلد ہی ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد مسلم لیگ کے سبھی ارکان گرفتار کر لئے گئے تھے اور یہ اسکول ایک عرصہ بند پڑا رہا تھا۔ بالآخر شہر کے نامور عالم دین مولانا محفوظ الرحمٰن نامیؔ نے جن کا تعلق کانگریس پارٹی سے تھا اپنے سیاسی رسوخ کا استعمال کر کے اسے اپنی تحویل میں لیا تھا اور اسکا نام مولانا ابو الکلام آزاد کے نام پر آزاد کالج رکھا تھا۔ سابقہ اسکول کے طالب علم نئے ادارے میں منتقل ہو گئے اور ان کی پڑھائی جامعہ مسعودیہ نور العلوم کی عمارت میں شروع ہوئی تھی جہاں سے میں نے بھی درجہ پنجم مکمل کیا۔ ایک عرصے بعد یہ ادارہ شہر کے مضافات میں واقع راجہ نانپارہ کی ایک کوٹھی میں منتقل ہو گیا تھا جہاں میں ڈیڑھ سال تک زیر تعلیم رہا۔ وہاں میرے خاص معلم مرزا حامد علی بیگ صاحب تھے جن کے ساتھ میں ادارے کے احاطے میں موجود مسجد میں پابندی سے ظہر کی نماز پڑھتا تھا، جبکہ جمعہ کے دن وہاں نماز سے پہلے چھٹی ہو جایا کرتی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں درجہ ششم کا امتحان میں نے آزاد کالج سے ہی پاس کیا۔ اگلے سال ساتویں کلاس کے وسط میں مجھے وہاں سے

گورنمنٹ انٹر کالج میں شفٹ کر دیا گیا جسکی عمارت شہر کے ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع تھی اور جہاں مدتوں پہلے خود والد مرحوم اور ان کے سبھی بھائیوں نے دسویں تک کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہاں کے اس وقت کے پرنسپل مسٹر ایمرسن ینگ سے والد مرحوم کے اچھے مراسم تھے اس لئے وہ مجھ پر خاص شفقت کا معاملہ کرتے تھے۔ وہاں میرے خاص اساتذہ میں ماسٹر سورج نرائن آرزوؔ تھے جو اردو کے اچھے شاعر تھے اور برسوں پہلے اسی ادارے میں والد مرحوم کے ہم جماعت رہ چکے تھے، دوسرے اردو کے استاد مولوی محمد حسن جو فیض آباد کے تھے، اور تیسرے مولوی سیّد حامد حسین جو محلّہ سیّد واڑہ میں رہتے تھے اور فارسی پڑھاتے تھے۔ اس کالج سے متصل ایک چھوٹی سی مسجد تھی جہاں میں مولوی محمد حسن صاحب کے ساتھ ظہر اور جمعے کی نماز پڑھنے جایا کرتا تھا۔ مولوی حامد حسین صاحب بھی اگرچہ شیعہ مسلک کے تھے مگر اسی مسجد میں علیحدہ نماز پڑھتے تھے۔ مولانا محفوظ الرحمٰن مرحوم کے بھانجے مولوی جنید بنارسی جو مدرسے کے طالبعلم اور میرے قریبی دوست تھے مجھ سے ملنے گاہے بہ گاہے وہاں آیا کرتے تھے۔ کالج کے کئی اساتذہ مجھے گھر پر ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے۔ کیونکہ آزادی کے بعد ذریعۂ تعلیم اردو کے بجائے ہندی ہو چکا تھا اس لئے والد مرحوم نے اسی کالج میں اپنے سابق استاد پنڈت رام بھروسے ترپاٹھی جی کو بلا کر مجھے گھر پر ہندی اور سنسکرت پڑھانے کی زحمت دی تھی۔

جون ۱۹۵۳ء میں جب میری والدہ کا اچانک انتقال ہوا تب میں نویں کلاس کا امتحان دے چکا تھا اور نتیجے کا انتظار تھا۔ انھیں کالج سے تھوڑا سا آگے اسٹیشن روڈ کے کنارے قدیمی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا تھا اور میں ان کی نماز جنازہ اور تدفین وغیرہ میں کم عمری کے باوجود والد مرحوم کے ساتھ قدم بہ قدم شریک تھا۔ اس حادثۂ جانکاہ کے بعد گھر کا ماحول سوگوار رہنے کے باعث مجھے کالج کے ہوسٹل میں منتقل کر دیا گیا تھا اور میں نے آئندہ سال ہائی اسکول کا امتحان وہیں رہ کر پاس کیا تھا۔ گیارھویں کلاس کی تعلیم کیلئے مجھے لکھنؤ کے کرسچین کالج بھیجا گیا تھا مگر وہاں کا ماحول راس نہ آنے پر سال کے بیچ ہی میں واپس بہرائچ بلا لیا گیا تھا جہاں میں نے گیارھویں کی کلاسیں کچھ دن گورنمنٹ انٹر کالج اور بعد میں شہر کے دوسرے کونے میں واقع مہاراج سنگھ کالج میں اٹنڈ کی تھیں۔ بہرائچ میں طالبعلمی کے زمانے میں میری تگ و دو بیحد محدود تھی، گھر سے اسکول اور واپس گھر عموماً پیدل آتے جاتے شہر کے تاریخی گھنٹہ گھر کے اندر سے گزر ہوتا تھا۔ والد مرحوم علیٰ الصباح ہواخوری کیلئے جھینگا گھاٹ جایا کرتے تھے جس میں کبھی کبھی میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ہمارے گھر کے ایک طرف جامع مسجد تھی اور دوسری طرف ایک چھوٹی سی مسجد فاطمہ، روزانہ فجر اور مغرب کی نمازوں کیلئے اس چھوٹی مسجد اور جمعے کی نماز کیلئے جامع مسجد جانا ہوتا تھا۔ کبھی کبھار والد بزرگوار کے ساتھ غازی میاں کی درگاہ سیّد سالار مسعود غازی جانا ہوتا تھا اگرچہ انھیں اس سے کوئی

عقیدت نہیں تھی، اور مجھے تو بالکل ہی نہیں تھی۔ گورنمنٹ انٹر کالج کے سامنے ایک وسیع میدان تھا جہاں کبھی کبھی نمائش لگا کرتی تھی اور مشاعرے بھی منعقد ہوا کرتے تھے، وہاں بھی والد صاحب کے ساتھ ہی جانا ہوا کرتا تھا۔ شہر کے معروف مزاح نگار شاعر سیّد ریاست حسین شوقؔ بہرائچی ایک عرصہ تک میرے والد کے محرر رہے تھے اور ایک خوش کلام اور مترنم شاعر محمد سعید خاں شفیقؔ بریلوی آزاد کالج کے پرنسپل تھے جبکہ والد مرحوم اس کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی صحبت نے میرے ادبی رجحان اور شاعرانہ ذوق کو بہت متاثر کیا تھا۔ اسکول میں میری دوستی اپنے ہم جماعتوں ساغرؔ مہدی، اظہارؔ وارثی اور شاعرؔ جمالی مرحومین سے ہوئی تھی جو آگے چل کر اردو کے قادرالکلام شاعر بنے تھے اور جن سے میرے دوستانہ تعلقات تینوں کی زندگی بھر قائم رہے۔ مجھے خود شعر و شاعری سے دلچسپی بچپن ہی سے تھی اور والدہ کے انتقال پر میں نے اپنی پہلی نظم کہی تھی۔

گیارھویں کلاس کے بعد میں اپنے تایا مرحوم سیّد مرتضیٰ حسن صاحب کے ساتھ جونپور چلا گیا تھا اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان میں نے وہیں سے پاس کیا تھا۔ اس کے آگے میری تعلیم گورکھپور اور لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ ۱۹۶۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان پاس کرکے میں پھر بہرائچ آیا تھا اور تقریباً ایک سال

اس پیشے میں طبع آزمائی کی تھی۔ وکالت کی پیشہ ورانہ تربیت پہلے شہر کے نامور وکیل آنجہانی بسنت رائے بھنڈاری سے اور بعد میں والد ماجد سے حاصل کی تھی۔ ان دنوں میں بھی میری آمد و رفت بس گھر اور کچہری کے درمیان ہی رہتی تھی، ہاں تہواروں پر والد صاحب کے ساتھ کئی معزز وکلاء کے گھروں پر جانا رہتا تھا۔ لیکن میری دلچسپی وکالت سے کہیں زیادہ شعر و ادب میں تھی اور میں نے انھیں دنوں ایک مرکزی مسجد میں منعقدہ ایک بڑے نعتیہ مشاعرے کی نظامت کی تھی۔ ستمبر ۱۹۶۰ء میں حضرت جگرؔ مرادآبادی کے انتقال کے موقعے پر میں نے سید واڑے میں واقع امام باڑے میں ''شام جگر'' کے نام سے ایک محفل منعقد کی تھی اور اسکی نظامت بھی خود ہی کی تھی۔

وکالت کا پیشہ میرے مزاج اور رجحان سے متصادم تھا اور مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس میں زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ چنانچہ بہت سوچ بچار کے بعد قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا۔ دو سال بعد وہاں سے فراغت ہوئی اور پھر معلمی کیلئے میرا قیام جونپور، بلرامپور، علی گڑھ اور دہلی میں رہا لیکن میں پابندی سے بہرائچ جا کر والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ ۱۹۶۹ء میں قانون میں مزید تعلیم و تحقیق کیلئے لندن جانا ہوا تو اس درمیان یہ سلسلہ منقطع رہا مگر واپسی کے بعد پھر شروع ہوا۔ والد مرحوم کی زندگی

میں آخری بار میں دسمبر ۱۹۷۳ء میں بہرائچ گیا تھا۔ میرے بڑے بھائی مرحوم سید اختر محمود کی شادی کے سلسلے میں وہ لکھنؤ میں مقیم تھے اور میں بھی اہلیہ کے ساتھ اس میں شرکت کیلئے گیا تھا، وہیں سے وہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ چند روز کیلئے بہرائچ لے گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں والد صاحب نے فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا تو خبر پاکر میں دہلی سے بھاگم بھاگ بہرائچ پہونچا۔ اس حادثے کے بعد بہرائچ سے دل اچاٹ سا ہو گیا اور آنے والے برسوں میں میرا وہاں جانا کم ہی رہا، بس خاندان کے بچوں کی شادیوں یا دیگر خصوصی مواقع پر مختصر قیام کیلئے جانا ہوتا تھا۔

دسمبر ۱۹۹۶ء میں قومی اقلیتی کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے بہرائچ کے سرکاری دورے کے دوران میں نے شہر کے متعدد اداروں میں منعقدہ تہنیتی جلسوں میں شرکت کی تھی۔ ۲۰۰۴ء کے بعد اب تک کے تقریباً ۱۷ سالوں میں بعض ناخوشگوار حالات کی وجہ سے میں صرف دوبار بہرائچ گیا ہوں، اور دونوں بار صرف چند گھنٹوں کیلئے، ایک بار ستمبر ۲۰۱۳ء میں چھوٹے بھائی خالد محمود کی عیادت اور دوسری بار دسمبر ۲۰۱۸ء میں ان کی تدفین میں شرکت کیلئے۔ اور اب اس سال اپریل میں میرے ایک اور چھوٹے بھائی راشد محمود کی اچانک وفات کے بعد تو بہرائچ میں میرے لئے کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ اب تو وہاں سے ربط بس بعض

مخلص اصحاب کے فون پر پیغامات کے ذریعے ہی رہتا ہے جن میں وہاں کے ایک نوجوان اسکالر میاں جنید احمد نور کا نام سر فہرست ہے جنھیں وہاں کی تاریخ اور مشاہیر کے حالات سے خاص دلچسپی ہے اور ان موضوعات پر تصنیف و تالیف کرتے رہتے ہیں۔ میرے بچپن میں بہرائچ ایک مختصر سا پس ماندہ شہر تھا، اسکی وسعت اور ترقی دونوں میں تیزی سے اضافہ بعد کے سالوں میں ہوا۔ لیکن میں نے اپنے وطن پدری کو نہ بچپن میں وہاں قیام کے زمانے میں پوری طرح دیکھا تھا اور نہ بعد میں وہاں کے مسافرانہ اسفار میں اسکی نوبت آئی۔ عقیدت اس شہر سے بہر حال ہمیشہ رہی جسکا اظہار وقتاً فوقتاً نثر و نظم میں ہوتا رہا۔

* * * * * * * * * * * * * *

ا۔ خالد میاں کی وفات پر میں نے اپنے ایک شذرے میں جو کچھ لکھا تھا اسے آئندہ مضمون میں میں ملاحظہ کیا جائے۔

۲۔ راشد میاں نے کرونا کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر ۱۹ اپریل ۲۰۲۱ء کو بہرائچ میں وفات پائی اور خاندانی قبروں کے پاس مدفون ہوئے۔

۳۔ بہرائچ سے میرے منظوم خراج عقیدت بھی اس کتابچے میں شامل کئے جا رہے ہیں۔

پدرم سلطاں بود

میرے ابّا جان سیّد محمود حسن علیہ الرحمۃ، مشرقی یوپی کے ایک ممتاز قانون داں اور ملّی قائد تھے۔ ان کا آبائی وطن ضلع رائے بریلی کا مردم خیز خطّہ جائس تھا جہاں سے ان کے دادا سیّد ہادی حسن مرحوم و مغفور جو ایک جیّد عالم دین تھے انیسویں صدی کے اواخر میں ہجرت کرکے شہر بہرائچ میں بس گئے تھے۔ ان کے والد بزرگوار حکیم سیّد احمد حسن جنّت مکانی بہرائچ کے ایک مستند عالم دین، حافظ قرآن، طبیب حاذق اور عربی کے استاد تھے۔ وہاں کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے دسویں پاس کرکے ابّا جان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہونچے، عربی میں ایم اے اور قانون کی ڈگریاں حاصل کیں اور واپس آکر بہرائچ اور لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہوئے، ملّی کاموں میں بھرپور حصّہ لیا، صوبائی دینی تعلیمی کاؤنسل کے مرکزی رکن بنے اور مادر درس گاہ علی گڑھ کے معاملات میں پیش پیش رہے اور نصف صدی تک اسی طرح نہائت فعّال و متحرک زندگی گزاری۔

ایک نہائت دیندار شخصیت تو ابّا جان شروع سے ہی تھے، عمر کے ساتھ ساتھ دینی شغف میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور وکالت سے بددل ہوگئے۔ عمر کا آخری حصّہ قرآنیات کے مطالعے میں گزار کے-قرآن پاک کی بیسک ریڈر-کے عنوان

سے ایک کتاب تحریر کی جس میں غیر عربی داں لوگوں کو عربی لب و لہجے میں تلاوت قرآن کے طریقے سجھائے گئے تھے۔ ۱۹۷۵ء کے اواخر میں سفر حج پر روانہ ہوئے اور مناسک مسنونہ ادا کرکے ۱۸ دسمبر کو مکہ معظمہ میں ہی داعی اجل کو بھی لبّیک کہہ دیا۔ خانۂ کعبہ میں نماز جنازہ ہوئی اور تاریخی قبرستان جنّت المعلیٰ میں مدفون ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد میں نے ان کی ابدی آرام گاہ پر حاضری دی اور واپس آکر ''حیات محمود'' کے عنوان سے ان کی سوانح مرتب کرنی شروع کی جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ فن تجوید پر ان کی مذکورہ کتاب اس کے پانچ سال بعد لکھنؤ میں مولانا منظور نعمانی کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوئی اور اس کا میرا تیار کردہ انگریزی ترجمہ ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا۔ ''حیات محمود'' کا پیش لفظ لکھتے ہوئے بہرائچ کے معروف عالم دین مولانا سلامت اللہ قاسمی مرحوم نے ابّاجان کے متعلق فرمایا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے موصوف کو دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے بے حد اہم شخصیت کا مالک بنایا تھا۔ ہر کہہ و مہہ چاہے وہ کسی مذہب کا کسی مشرب کا ہو ان کو انتہائی عظمت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اپنے پرائے سب میں وہ مقبول تھے، سب کے دلوں میں محمود، سب کی زبان پر ممدوح تھے، حقیقتاً اور یقیناً اسم با مسمیٰ تھے۔ دینی اور فقہی علوم سے بے حد شغف تھا، فقہ اور تفسیر پر بہت دسترس حاصل تھی۔ قرآن پاک اور اس کے تراجم کا مطالعہ ان کا بے حد محبوب مشغول تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مومنانہ جرأت بدرجۂ اتم بخشی تھی۔ قول حسن ہمیشہ ان کا شیوہ رہا۔ کسی کے سامنے

قول حق سے کبھی گریز نہیں کیا، جذبۂ توحید رگ و پے میں سرایت تھا اور اسکا مظاہرہ قول و عمل سے برابر ہوتا رہتا تھا۔"

میرے بچپن کے دوست بہرائچ کے معروف ادیب و شاعر ساغر مہدیؔ مرحوم نے "حیات محمود" میں ابّا جان کی مرنجا مرنج شخصیت کا تجزیہ یوں کیا ہے "۔انکے نحیف پیکر میں ایک متبحر عالم دین کا علم، ایک غیر معمولی اور نکتہ رس مفسر قرآن کا ذہن، فارسی اور اردو شعر و ادب کے زبردست اسکالر کی نگاہ و بصیرت، تہذیب و ثقافت کے پر وقار امین کے مزاج، مرد مومن کی شان، اظہار حق کی جرأت اور کردار کی قوت کا حسین امتزاج تھا۔"

میں دل سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ ابّاجان ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے مجھے دین و دنیا، قرآن و حدیث، قانون و ادب سبھی کچھ سکھایا اور چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، کھیلتے کھاتے، ڈانٹتے ڈپٹتے، گرجتے برستے، روٹھتے منتے سکھایا۔ مانجھا سنوارا، کھرچا چمکایا اور مس خام کو کندن بنانے کی ناکام کوشش میں عمر گزار دی۔ میرے نظریات و خیالات اور ناچیز علمی کاوشیں سب یقیناً انھیں کی مرہون منّت ہیں۔ انھیں دنیا سے گئے اس سال دسمبر میں اڑتالیس سال ہو جایں گے لیکن میرے ذہن و دل خوابوں اور خیالوں میں وہ آج بھی حیات ہیں۔ بقول حضرت جگرؔ مرادآبادی:

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

قصّہ ٔ چہار درویش

ہم یہاں طوطی ٔ ہند حضرت امیر خسروؔ کے شہرہ آفاق شاہکار ''قصّہ ٔ چہار درویش'' یا اس کے اردو ترجمے ''باغ و بہار''۔ پر اظہار خیال کی جرأت نہیں کر رہے ہیں۔ بچپن میں ہم نے یہ لازوال ادبی شاہکار پڑھے تھے مگر ان پر ہمارا کوئی تبصرہ کرنا اردو کے محاورے چھوٹا منہ اور بڑی بات کی مثال ہو گا۔ ہمیں تو یہاں ان چار درویشان اردو کا ذکر مقصود ہے جنکی جگری دوستی گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں مشرقی یوپی کے ایک چھوٹے سے شہر میں ابتدائی تعلیم کے زمانے میں شروع ہوئی تھی۔ بچپن سے ہی مادری زبان اردو کے عشق میں گرفتار ان چار یاروں میں سے ایک تو ہم خود تھے جسے آگے چل کر علم قانون میں درس و تدریس اور کتابیں پڑھنے لکھنے میں زندگی بتانی تھی اور باقی تین وہ جن کیلئے کاتب تقدیر نے مستقبل میں اردو کے سخنوران کامل کی فہرست میں نام درج کروانا مقسوم کر رکھا تھا۔

قدرت نے ہمیں باضابطہ شاعر نہ بنا کر پتہ نہیں رحم فرمایا کہ ظلم لیکن شعر و شاعری سے گہری دلچسپی اور ٹوٹے پھوٹے اشعار کہہ لینے کی صلاحیت عہد طفلی میں ہی بخش دی تھی۔ ہمارے بزرگوں کا آبائی تعلق تو ضلع رائے بریلی کے

مردم خیز خطّے جائس سے تھا مگر فکر معاش میں اودھ کے شہر بہرائچ میں جا بسے تھے۔ خود ہم نے آنکھیں تو لکھنؤ میں رہائش پذیر اپنے نانا خان بہادر سیّد احسان عظیم مرحوم و مغفور کے کاشانے میں کھولی تھیں جو صوبائی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے مگر بچپن بہرائچ میں سخن فہم اور سخن نوازوالدین کے سایۂ عاطفت میں گزرا تھا۔ پدر بزرگوار مرحوم سیّد محمود حسن شہر کے ایک نامور وکیل تھے اور ان کے منشی جی سیّد ریاست حسین شوقؔ بہرائیچی وہاں کے ایک مقبول عام ظرافت نگار۔ چنانچہ ادبیات میں گہری دلچسپی اور نثر و نظم میں طبع آزمائی کیلئے ماحول انتہائی سازگار ملا۔ باقاعدہ شعر گوئی کی ابتدا تقریباً تیرہ سال کی عمر میں ہوئی جب ہمیں جنم دینے والی ہستی کو خالق کائنات نے اچانک اپنے پاس بلا کر ہماری روح کو جھنجھوڑ دیا اور ہم نے اس المیے پر ایک بچکانہ نظم کہی۔ نصف صدی بعد دہلی میں ہمارے بزرگ دوست مرحوم رفعت سروشؔ نے اس پرانی نظم کے حوالے سے اپنے ایک اخباری مضمون میں لکھا تھا کہ ”اس عمر میں ایسے بلیغ شعر کہنے والا یہ طفل مکتب اگر کوچۂ قانون کی طرف نہ نکل گیا ہوتا تو آج اسکا شمار نامور شعراء میں ہوتا“۔ بہر حال بچپن میں ہماری شعر گوئی کو جلا اپنے ان تین جگری دوستوں اور ہم مکتبوں کے ذوق شعری سے بھی ملی تھی جو آگے چل کر دنیائے سخن میں ساغرؔ مہدی، شاعرؔ جمالی اور اظہارؔ وارثی کے ناموں سے معروف و مقبول ہوئے تھے اور آج دنیا میں نہیں ہیں۔ ذہن و دل کے دریچوں میں محفوظ ان کی کچھ یادیں ہم

قارئین کی نذر کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے بعد بچپن سے دم آخر تک انھیں قریب سے جاننے والا کوئی ان کی کہانی سنانے کو باقی نہ بچے گا۔

سیّد ساغرؔ مہدی بہرائچ میں اہل تشیع کی مشہور بستی سیّد واڑہ میں رہتے تھے۔ کم عمری میں والدین کی شفقت سے محروم ہو کر وہ اور بڑے بھائی اصغر مہدی اپنے ماموں سیّد ہدایت حسین زیدی وکیل کے زیر عاطفت تھے جو برسوں پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہمارے والد مرحوم کے ہم جماعت رہ چکے تھے اور اسی نسبت سے دونوں خاندانوں میں خاصی قربت تھی۔ شہر کے گورنمنٹ ہائی اسکول اور پھر مہاراج سنگھ کالج میں ساغرؔ ہمارے معاصر تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے مصرعوں پر گرہیں لگاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک ساتھی نے جنکے ناخن بڑھے ہوئے تھے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم نے فی البدیہ مصرع پڑھا کہ ”آپ نے خنجر خونخوار سے انگلی چھو لی“ تو ساغر نے اس پر فوراً مصرع ثانی لگایا ”فصد اس ہاتھ کی حد درجہ ستم سے کھولی“۔ ساغرؔ کے بھائی اصغر بچپن ہی میں پاکستان چلے گئے تھے اور بعد میں نظمیؔ کے قلمی نام سے شعر گوئی کرنے لگے تھے۔ پھر شفیق ماموں ایک دن دیوانی کچہری میں بیٹھے بیٹھے اچانک واصل بحق ہوگئے تو وہ بالکل اکیلے رہ گئے اور اپنائیت کی جستجو میں ہمارے خاندان سے اور زیادہ قریب ہوگئے۔ ایک عرصے بعد جبکہ ہم تو تلاش علم میں ترک وطن کر چکے تھے ساغرؔ نے شہر کے آزاد کالج میں

مصروف تعلیم ہو کر ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں خاصا مقام بنالیا۔ ہمارے والد مرحوم آزاد کالج کے ناظم اعلیٰ اور وہاں کے پرنسپل محمّد سعید شفیقؔ بریلوی اردو کے کہنہ مشق شاعر تھے، دونوں نے ہی ان کی بہت ہمّت افزائی کی۔ سعید صاحب بعد میں جونپور کے محمّد حسین مسلم کالج کے پرنسپل بن کر وہاں پہونچے تو ہم وہاں کے ایک ڈگری کالج میں قانون کے نووارد لکچرر تھے اور وہ ایک عرصہ ہمارے مہمان رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں ساغرؔ کا ایک شعر سنایا تھا جو انھوں نے بہرائچ میں ان کی الوداعی تقریب میں پڑھا تھا:

نہ روک پائے آپ کو یہ واقعہ عجیب ہے
مری غریب درسگاہ کس قدر غریب ہے

ساغرؔ بعد میں مہاراج سنگھ کالج میں اردو کے لکچرر ہو گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں جبکہ ہم لندن میں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے غریب پرور شہر دہلی میں آ بسے تھے ہمارے والد محترم نے مکّہ معظّمہ میں اللّٰھم لبّیك کی صدائیں بلند کرنے والے حجّاج کرام کے ساتھ فریضۂ حج ادا کیا اور اس کے معاً بعد "جو کوئی یار سے نکلے تو سوئے دار چلے" پر عمل کرتے ہوئے وہیں داعیؔ اجل کو بھی لبّیك کہہ دیا۔ اس حادثۂ جانکاہ پر عنادل خانہ کے ساتھ مل کے آہ و زاریاں کرنے ہم وطن پدری پہونچے تو ساغرؔ بھی شریک غم ہونے آئے اور ایک مشہور شعر میں کچھ تبدیلی کرکے اس طرح پڑھا:

نہ اب بزرگ نہ ناصح نہ غمگسار کوئی
کسی کے ساتھ گئیں آشنائیاں کیا کیا

اس سانحے کے ٹھیک پانچ سال بعد دسمبر ۱۹۸۰ء میں ساغرؔ صرف اڑتالیس سال کی عمر میں فردوس میں اپنے اور ہمارے بزرگوں سے جا ملے۔ ساغرؔ کا پہلا مجموعہ کلام ''دیوانجلی'' کے دلچسپ عنوان سے غالباً ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا جس میں ان کی بہت سی نظمیں شامل تھیں اور سرورق پر لکھا تھا ''زخمی شبدوں کی کتاب زخمی روحوں کے نام''۔ غزلوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ انھوں نے ''حرف جاں'' کے نام سے ترتیب دیا تھا مگر جہاں تک ہمیں یاد ہے اسکی اشاعت ان کی وفات کے بعد ہو سکی تھی۔ ساغرؔ اردو اخبارات میں برابر مضامین بھی لکھتے تھے جنکا ایک مجموعہ ''تحریر و تحلیل'' کے نام سے چھپا تھا، مگر اب تو ان کی یہ سب تخلیقات نقش و نگار طاق نسیاں ہو چکی ہیں۔

بہرائچ میں ہمارے ابّا جان کی کوٹھی کے عقب میں سڑک کے دوسری طرف ایک اور وسیع و عریض کوٹھی تھی جسکے مالک جناب فیض الحسن شہر کے ایک نامی گرامی وکیل تھے۔ ۱۹۲۸ء میں ابّا جان علی گڑھ سے وکالت کی ڈگری لے کر واپس آئے تو عدالتی نظام کی لازمی تربیت کیلئے ان کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کیا۔ ان کے بڑے بیٹے منظور حسن بھی وکیل تھے جو ابّا جان سے قدرے سینیر تھے۔ منظور صاحب کے بیٹے مظہر حسن پہلے بھوپال کے کسی ادارے میں پڑھاتے تھے بعد میں بہرائچ آکر

وکالت کرنے کا فیصلہ کیا تو ابّا جان نے انھیں اپنے زیر تربیت لے کر اپنے استاد کا قرض اتار دیا۔ اس طور پر اس خاندان سے بھی ہم لوگوں کا پشت در پشت تعلّق تھا۔

فیض الحسن صاحب کی کوٹھی کے عقبی صحن کے ایک کونے میں واقع ایک چھوٹے سے بوسیدہ مکان میں ایک کنبہ رہتا تھا جسکی ان سے دور کی قرابت تھی۔ اس خاندان کا اکلوتا خوبرو اور خوش گلو بیٹا بچپن میں ہمارا ہمدم و دمساز تھا اور دونوں خالی اوقات میں شعر و شاعری کرنے اور ترنّم سے اساتذہ کی غزلیں سنانے میں مصروف رہتے تھے۔ نام تو اسکا سیدّ نذر الحسنین تھا مگر اپنی عرفیت پاشاؔ کے نام سے معروف تھا۔ تعلیم مکمّل کر کے اس نے سرکاری ملیریا ڈپارٹمنٹ کے مقامی دفتر میں ملازمت اختیار کی۔ آنے والے سالوں میں ترقّی ملی اور آخر میں شیر از ہند جونپور پہونچا جہاں سے ہم نے بھی کچھ سال پہلے اپنے تدریسی سفر کا آغاز کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد جبکہ ہم دہلی میں مقیم تھے اس نے ایک خط میں ہمیں لکھا کہ ’’یہاں مجھے ایک لڑکی سے ضرورت ہو گئی ہے عشق و شق کا معاملہ نہیں ہے شادی کا ارادہ ہے اس لئے ضرورت لکھا ہے‘‘ اور پھر کچھ دنوں بعد رشتۂ ازدواج میں بندھ کر جونپور ہی کا ہو رہا۔ نئے لب و لہجے کے ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے خاصی شہرت ملی اور قدردانوں نے ’’میر صاحب‘‘ کا لقب دیا۔ پہچانا آپ نے ان میر صاحب قبلہ و کعبہ کو؟ بچپن میں پاشاؔ کے نام سے معروف یہ وہی ہمارے عزیز دوست تھے جنھیں آگے چل کر دنیائے سخن میں ’’شاعرؔ جمالی‘‘ کے قلمی نام سے

بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ لفظ ''جمالی'' کی وجہ تسمیہ ہمیں صحیح تو نہیں معلوم ہے لیکن شاید یہ بہرائچ کے ایک کہنہ مشق شاعر بابا جمالؔ سے نسبت تلمیذ کا مظہر تھا۔

اکتوبر ۲۰۰۸؁ء کی ۱۹ تاریخ شاعرؔ جمالی کیلئے اچانک پیغام اجل لے کر آئی اور ''مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور'' کا منظر نامہ دکھاگئی۔ جونپور سے بہرائچ جاتے ہوئے راستے میں فیض آباد ریلوے اسٹیشن پر دل کا سخت دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہیں ہوسکے۔ انھوں نے ایک بار انسانی زندگی کی تلخ حقیقت اپنے ایک شعر میں یوں بیان کی تھی:

شام ڈھلے ہر پنچھی کو گھر جانا پڑتا ہے
کون خوشی سے مرتا ہے مر جانا پڑتا ہے

آسمان شعر وادب میں بڑی سرعت سے چھلانگ لگانے والا یہ تیز رو پنچھی اس دن خود اپنے اس شعر کا مصداق بن کر لقمۂ اجل ہو گیا جبکہ اسکی شام تو ابھی پوری طرح ڈھلی بھی نہیں تھی۔ تدفین کیلئے جسد خاکی بہرائچ لے جایا گیا، گویا'' پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا'' اور قصبہ نانپارہ کے ایک قدیم قبرستان میں ابدی نیند سلا دیا گیا۔ ان سے ہماری مراسلت کم ہوتے ہوتے بالآخر منقطع ہو چکی تھی جس میں ہم دونوں کی بے انتہا مشغولیت کو دخل تھا۔ اخبار میں اس روح فرسا سانحے کی خبر پڑھ کر کئی دنوں تک ہماری کیفیت ''پہروں تو مزاج دل ناداں نہیں

ملتا'' کی رہی۔ ہمیں ان کے پسماندگان کا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا کہ تعزیت پیش کرتے لیکن تعزیت کے مستحق تو ہم خود بھی تھے اسی پر اکتفا کرلی۔ کئی سال بعد ایک دن سعودی عرب سے ظفرالحسنین نامی ایک صاحب نے ہمیں فون کیا اور بتایا کہ وہ بچپن کے ہمارے اس یار غار کے بیٹے ہیں وہاں ملازمت کرتے ہیں اور خود بھی شعر کہتے ہیں۔ انھوں نے فیس بک پر ہماری تصویریں اور تحریریں دیکھ کر ازراہ سعاتمندی ہمیں ڈھونڈ نکالا تھا۔ بھولے بسرے تعلّق کی تجدید ہوئی اور اکثر رات گئے فون پر بات چیت ہونے لگی۔ شاعرؔ جمالی منفرد لب و لہجے کے مقبول عوام شاعر تھے جنکی غزلیں اخبارات و رسائل میں برابر چھپتی رہتی تھیں۔ سو سے زائد غزلوں پر مشتمل ایک مجموعہ ''صحیفہ'' کے عنوان سے شاید ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا جسکے سرورق پر یہ شعر تحریر تھا:

مجھ کو تاریخ میں محفوظ کیا جائے گا
میں صحیفہ ہوں کوئی روز کا اخبار نہیں

اس اسم با مسمّیٰ شاعر کے پاس مسحور کن اشعار کا ایک بھرا پرا خزانہ تھا مگر جس شعر نے انھیں شہرت عام بخشی دہ یہ معنی خیز شعر تھا:

تم آسماں کی بلندی سے جلد لوٹ آنا
ہمیں زمیں کے مسائل پہ بات کرنی ہے

آیئے اب بچپن کے ان چار درویشان اردو کے چوتھے رکن کی سرگزشت سنئے۔ بہرائچ کے صدر بازار کے عقب میں برہمنی پورہ نامی ایک گنجان محلّے میں اظہرؔ وارثی نام کے ایک بزرگ رہتے تھے جنھوں نے اپنے والد حکیم صفدر وارثی مرحوم کی گدّی سنبھال رکّھی تھی، مطب بھی کرتے تھے اور شاعری بھی۔ ان کے ہونہار بیٹے اظہارؔ وارثی عمر میں ہم سے تھوڑے سے بڑے اور اسکول میں ہم جماعت تھے۔ ہم دونوں اکثر موقعے کی مناسبت سے اساتذہ کا کلام برملا پڑھا کرتے تھے۔ آگے چل کر ساغرؔ مہدی نے دنیا چھوڑی اور شاعرؔ جمالی نے بہرائچ شہر، لیکن میاں اظہارؔ وہیں ڈٹے رہے اور برابر ہمارے ربط میں رہے۔ ایک بار انھوں نے بڑے جذباتی انداز میں ہم دونوں کے زندگی بھر کے ساتھ کا نقشہ ایک طویل نظم میں اس طرح کھینچا تھا:

دو ہم نفس وہ اور میں، میں اور وہ، بچپن کے دن
آدھی صدی کی دوستی کا عہد زرّیں
روز کا ملنا بچھڑنا ساتھ پڑھنا ساتھ لکھنا
اور اب کچھ بھی نہیں یادوں کی خوشبو کے سوا
آج اس کے زیر پا دنیا کا نقشہ اور میرے سر پہ ان رستوں کی دھول
جن پر بنا کرتے تھے میرے اور اس کے نقش پا شانہ بہ شانہ

اب کہاں وہ میں کہاں محدود میری شخصیت اس کا تشخّص بیکراں
دو چار برسوں میں اس سرزمیں کی طرف
جسکی ہوا میں ہم نے پہلی سانس لی تھی
راہ اسکی رخ بدلتی ہے تو آملتا ہے وہ
اسکا خلوص معتبر زندہ رہا ہر دور میں
جب بھی ملا مجھ کو لگا میرا ہے وہ، اس کا ہوں میں

گزشتہ صدی کے اواخر میں جب وزیر اعظم وقت ایچ ڈی دیو گوڑا کی حکومت نے دہلی میں قومی اقلیّتی کمیشن کی سربراہی بالکل غیر متوقع طور پر ہمیں تفویض کی تو یہ بار گراں اٹھانے کیلئے ملک بھر سے قدردانوں نے خیر سگالی اور نیک خواہشات کے پیغامات بھیجے۔ اس موقعے پر ہمارے عزیز دوست اظہارؔ وارثی نے جن جذبات کا اظہار کیا تھا انھیں بعد میں ہم نے اپنی ایک کتاب میں محفوظ کر لیا تھا۔ اقتباس ملاحظہ کریں :

اے ہم نفس اے عہد رفتہ کے شریک معتبر
ذہن کی پرتوں میں اب بھی تہہ بہ تہہ محفوظ ہیں
تیری رفاقت کے درخشندہ نقوش تیری رفاقت کو سلام
اے صاحب ادراک اے ذی فہم اے اہل شعور
آسماں چھونے کو ہے قد آوران ملک و ملّت میں تری قد آوری

تیرا تشخّص آئینہ در آئینہ جلوہ نما، سوچیں تری تزئین کار عہد نو
نظریں تری بارک بین و دور رس
تیرا قلم قانون کا عقدہ کشا، مرحبا صد مرحبا

اظہارؔ وارثی کا پورا کلام ہم نے پڑھا ہے، بار بار پڑھا ہے اور ان کی خیال آفرینی کو دل سے سراہا ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار نے جو انھوں نے علّامہ اقبالؔ کے مشہور زمانہ شعر

"باغ بہشت سے مجھے حکم سفر ہوا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر"

کے حوالے سے لکھے تھے ہمیں بے حد متاثر کیا تھا :

کسی سے تم اذن سفر لے کے آئے ہو
کار جہاں کی درازی کو یکسر بھلا کر
نئے دیس میں صرف سانسیں گنوا کر کہاں تک رہو گے
تمہیں اپنے ہونے کی توثیق کرنے کی خاطر
زمیں کی تہوں میں اترنا بھی ہے
آسمانوں کو مٹّھی میں بھرنا بھی ہے
اس سے پہلے کہ گھر سے کوئی آ کے کہہ دے چلو گھر چلو

زندگی کے مختلف ادوار میں اظہار وارثیؔ نے اپنے مختلف الاصناف کلام کے تین مختصر مجموعے شائع کروائے تھے جن میں ”کبوتر سبز گنبد کے“ حمد و نعت پر مشتمل ہے۔ ”کشت خیال“ میں غزلیں اور نظمیں وغیرہ شامل ہیں اور ”سوچ کی آنچ“ میں ثلاثی، ماہیئے اور دوہے۔ اب سے قریب دو سال پہلے جبکہ وہ متعدّد بیماریوں میں مبتلا ہو چکے تھے انھوں نے ایک دن فون پر ہمیں بتایا کہ ان کا باقی ماندہ کلام ”شب تنہائی کا چاند“ کے عنوان سے مرتّب کیا گیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے ”رسوخ“ کا استعمال کرکے اسکی اشاعت کیلئے کسی ادارے سے مالی اعانت کا انتظام کردادیں ۔ اب رسوخ وسوخ ہمارے پاس کہاں دھرے تھے، مسودہ منگوا کے خاموشی سے ایڈیٹ کیا، پیش لفظ لکھا اور اپنی طرف سے چھپوا دیا کہ شائد اس طرح نصف صدی سے زائد کی دوستی کا حق کسی قدر ادا ہو جائے۔ کتاب کے نسخے پہونچے تو بے انتہا خوشی کا اظہار کیا اور ہمیں لکھا کہ اسکی بدولت بیماری کی شدّت میں قدرے کمی آنے لگی ہے۔ لیکن ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اور چند ماہ بعد ہی پرانے عارضوں نے مزید ترقّی کرکے انھیں صاحب فراش کر دیا مگر پھر بھی ان سے ہر ہفتے فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔

ایک دن چند روز کے بیرونی سفر سے واپس آکر ہم نے فون کیا تو نقاہت بھری آواز میں بولے کہ ”ہمارا آخری سلام لے لو آئندہ شاید ہم بات کرنے کے

قابل نہ رہیں"۔ اس کے دو ہفتے بعد ۲۱ اگست ۲۰۱۸ء کو اظہار میاں چل دیئے، وہاں ہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔

****

ہمارا قصّۂ چہار درویش تو ختم ہوا لیکن ہم ابھی اظہار وارثی کے بعد بچھڑنے والے اپنے ایک اور عزیز دوست کا مختصر تذکرہ کرنا چاہیں گے جنھوں نے ہمارے اس قصّۂ پارینہ کا شروع سے آخر تک ہر قدم پر قریبی مشاہدہ کیا تھا۔

یہ تھے ہمارے حقیقی بھائی خالد محمود ہمارے حقیقی بھائی خالد محمود، عمر میں دو سال چھوٹے، تعلّقات میں بھائی کم دوست زیادہ، ہماری ہی طرح شعر و ادب کے دلداہ، اور بہرائچ کیگورنمنٹ اسکول سے لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک ہمارے ہم پیالہ و ہم نوالہ۔ علی گڑھ سے نباتیات میں ڈگری لے کر ضلع بہرائچ سے متّصل ریاست نیپال کے شہر نیپال گنج کے ایک کالج میں پڑھانا شروع کیا۔ لیکن اردو کی چاشنی تو ان کی بھی گھٹّی میں ملی ہوئی تھی، ایک خشک سائنسی مضمون میں تدریسی مشغولیت اس پر بھلا کیسے غالب آسکتی تھی۔ چنانچہ اخبارات میں لکھنا شروع کیا، مضامین کا ایک مجموعہ "نثری کاوش" کے عنوان سے ملک زادہ منظور احمد مرحوم و مغفور کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا اور جلد ہی شہر کی ادبی محفلوں کی روح رواں بن گئے۔ اب سے کئی سال پہلیانسان کو اندر سے آہستہ آہستہ گھلا کے رکھ دینے والے ایک موذی مرض میں مبتلا

ہوئے اور کئی سال سخت جسمانی و دماغی تکلیف جھیل کر بالآخر ۷ا دسمبر ۲۰۱۸ء کو لکھنؤ کے ایک اسپتال میں زندگی کی جنگ ہار گئے۔ ہم تب سنگاپور کے سفر پر تھے، حالت نازک ہونے کی خبر پاکر بھاگم بھاگ دہلی کے راستے لکھنؤ پہونچے لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ جسد خاکی کو تدفین کیلئے بہرائچ لے جایا گیا اور والدہ مرحومہ کے جوار میں ابدی نیند سلا دیا گیا۔ قبرستان میں ہماری آنکھوں میں 65 سال پہلے کا وہ المناک منظر گھوم گیا جب ہم نے اپنے چھوٹے چھوٹے کمزور ہاتھوں سے ٹھیک اسی جگہ اپنی جان چھڑکنے والی ماں کی قبر پر مٹّی ڈالی تھی۔

دل کی دھڑکن کی رفتار خطرناک حد تک بڑھی ہونے کی کیفیت میں ہم نے اب ایک زندگی بھر کی برادرانہ اور دوستانہ رفاقت کو بھی وہیں زمین کی گہری تہوں میں گم ہوتے دیکھا اور ایک بار پھر جناب منوّر رانا کا یہ مبنی بر حقیقت شعر دل ہی دل میں دہراتے رہے:

ہم کو معلوم ہے شہرت کی بلندی ہم نے
قبر کی مٹّی کو دیکھا ہے برابر ہوتے

* * * * * * * * * *

بادشاہِ طنز و ظرافت جناب شوقؔ بہرائچی [1]

اردو کے دو الگ الگ زباں زدِ عوام مصرعے ہیں ع ''ہر شاخ پہ الوّ بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہو گا'' اور ''بے زر کا کوئی بہنوئی نہیں زردار کے لاکھوں سالے ہیں''۔میں نے یہ دونوں مصرعے متعدّد موقعوں پر بار بار سنے ہیں ۔باضابطہ تحریروں میں بھی اور بے تکلف باتوں میں بھی۔ان میں سے دوسرا مصرع تو ایک منچلے فلم ساز نے ایک بار اپنی فلم میں بھی استعمال کر لیا تھا۔مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے اکثر نے بھی یہ مصرعے ضرور سنے اور سنائے ہوں گے اور یہ یقیناً آپ کے ذہنوں میں محفوظ ہوں گے۔البتہ جس بات میں مجھے شک ہے وہ یہ ہے کہ ان مصرعوں کے خالق سے صحیح واقفیت یا اس کے حالات کا قدرے علم رکھنے والوں کی تعداد شاید بہت زیادہ نہ ہو۔کوئی ان مصرعوں کو غلطی سے حضرت اکبرؔ الٰہ آبادی سے منسوب کرتا ہے اور کوئی کسی اور معروف مزاح نگار سے۔صد حیف کہ ان لازوال مصرعوں کا اصل خالق آج گمنامی کے اندھیروں میں محو استراحت ہے اور اس کے لاجواب فنِ طنز نگاری پر آج اس کی وفات کے ایک تہائی صدی بعد بھی دنیائے ادب کی بے وجہ ناقدری کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔اس کے نہ جانے کتنے مقبول زمانہ معاصر اور معروف و غیر معروف واقف کار بھی، جو اس کے کمال فن

[1] یہ مضمون ''جرأت رندانہ'' مطبوعہ ۲۰۰۱ء سے نقل کیا گیا ہے۔

کے معترف تھے یا اس پر روشنی ڈال سکتے تھے، اب اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ کم ہی لوگ آج اس عظیم فنکار سے ذاتی واقفیت رکھنے کا دعویٰ کر سکیں گے اور میرا نام خوش قسمتی سے اس محدود فہرست میں شامل ہے۔

جن دو معنی خیز مصرعوں سے میں نے اپنی بات شروع کی تھی وہ ان دو مکمل اشعار کا حصہ ہیں ع

برباد گلستاں کرنے کو بس ایک ہی الوّ کافی تھا
ہر شاخ پہ الوّ بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا

*****

اللہ غنی اس دنیا میں سرمایہ پرستی کا عالم
بے زر کا کوئی بہنوئی نہیں زردار کے لاکھوں سالے ہیں

اور طنز و، مزاح کے شاہکار ان خیال آفریں اشعار کے خالق تھے سید ریاست حسین شوقؔ بہرائچی مرحوم و مغفور۔ میں نے اب سے ۴۵-۴۰ سال قبل جناب شوقؔ کو اپنے وطنِ پدری شہر بہرائچ اور متعدد اور جگہوں پر دیکھا تھا اور خوب خوب انجمن آرا دیکھا تھا۔ طفولیت اور آغازِ شباب کے زمانے کی نہ جانے ایسی کتنی تصویریں میرے ذہن کے نگار خانے میں محفوظ ہیں جن میں ان کے ضعف و ناتواں پیکر کا

عکس نظر آتا ہے یا اُن کی لرزیدہ آواز ابھرتی ہے۔ آیئے آج ان میں سے کچھ تصویریں آپ کو بھی دکھاتا چلوں۔

وطنِ عزیز کی انتہائی دل خوش کن آزادی اور اس کی بے حد افسوسناک تقسیم کو ابھی صرف چند سال ہی گذرے ہیں۔ زبردستی ٹھونسی گئی غیر فطری سیاسی سرحد کے دونوں طرف سرگرم سیاست کا دور دورہ ہے۔ مذہبی اور لسانی تعصب اور منافرت کے گہرے بادل منڈلا رہے ہیں۔ جیالی زبان اردو بھر بھی زندہ ہے اور عوامی جلسوں، مشاعروں اور پردۂ سیمیں کے مکالموں اور نغموں کے ذریعے اپنی مقبولیت کا لوہا بدستور منوا رہی ہے۔ مشرقی یوپی کے دور افتادہ شہروں سے لے کر عروس البلاد بمبئی اور جنوب میں مدراس تک میں اب بھی مشاعروں اور ادبی محفلوں کا انعقاد ہو رہا ہے۔ اردو شاعری میں حسب سنجیدگی اور متانت بھی ہے اور طنز و ظرافت بھی۔ دونوں طرف اساتذۂ وقت کو ائف زمانہ پر بھرپور وار کر رہے ہیں۔ اسی ادبی مناظر میں ایک کہنہ مشق بادشاہِ سخن شوقؔ بہرائچی اپنا ظریفانہ کلام جگہ جگہ پیش کر کے سامعین کی صفیں الٹتے نظر آتے ہیں۔ عمر گزیدہ تنِ نازک ،ذہن ضعیف دانتوں سے بے نیاز، ہاتھوں میں رعشہ، آواز میں لرزہ، پھر بھی کلام ایسا جاندار کہ شائقینِ ادب کے زبردست مجمعوں میں بھی اپنا بھرپور جادو دکھا رہا ہے اور بزرگ شاعر مکرّر ارشاد کی فرمائشوں اور تحسین و توصیف کے نعروں کی

یلغار میں گلے گلے ڈوبے جارہے ہیں۔ میں ''ایک طفل مکتب''لیکن کم عمری کے باوجود اردو نثر و نظم کی شیرینی کا پوری طرح ذائقہ شناس اس منظر نامے کا عینی شاہد ہوں۔

جناب شوق سنا ہے کہ ضلع فیض آباد کے باشندے تھے۔ تلاش معاش میں شہروں شہروں پھرے، اعظم گڑھ میں آج کی ادبی دنیا کے پیر میخانہ جناب کیفیؔ اعظمی کے والد بزرگوار کے محرّر بنے اور بالآخر مستقلاً شہر بہرائچ میں جابسے اور اسی غریب پرور شہر کو وطن مالوف بنالیا۔ یہیں ان کی اہلیہ بلدیہ کی رکن منتخب ہوئیں تو مظلوم شوہر نے یوں تہنیت پیش کی ؎

ہمیں لے کے بوسہ رُخ پر شکن کا
یہ باسی سوئیاں سوارت کریں گے

یہیں اُن کے صاحب زادے یہ نعرہ لگاتے ہوئے اساطِ سخن پر نووارد ہوتے دیکھے گئے کہ ''جناب شوقؔ کا بیٹا تخلص ذوقؔ کرتا ہوں''۔ بہرائچ، لکھنؤ، گورکھپور اور ان اطراف کے کئی اور شہروں میں جناب شوقؔ کو مشاعرے لوٹتے میں نے بچپن اور عنفوان شباب خود دیکھا تھا۔ بارہ برس کی عمر میں جب خود مجھے شعر گوئی کا شوق ہوا تھا تو اپنی چند ابتدائی کاوشیں بغرض اصلاح انہیں دکھائی بھی تھی اور خود اپنے گھر پر ح حسبِ تربیت خاندانی اُن کی جوتیاں بھی سیدھی کی تھی۔ غالباً ۱۹۶۴ء میں

،جب کہ میں نے تعلیم مکمل کرکے جونپور میں ملازمت شروع ہی کی تھی،ایک دن علی الصباح اردو کے اخبار میں شائع ایک جلی سرخی پر نظر پڑی "شوقؔ بہرائچی کا انتقال"۔ذہن و دل پر ایک بجلی سی گری۔بھاگم بھاگ جاکر یہ افسوسناک خبر شفیقؔ بریلوی مرحوم کو دی، کہ وہ بھی بہرائچ کے تھے اور ان دنوں جونپور میں میرے پڑوسی تھے۔ایک عظیم فنکار کی کسمپرسی میں موت پر ہم دونوں عرصہ تک دل گرفتہ رہے۔

عمر کا ایک بڑا حصہ جناب شوقؔ نے تنگدستی اور افلاس میں گذارا تھا اس عالم میں اپنوں اور غیروں کی بے رخی کے یوں شاکی ہوئے تھے ؏

زمانہ یوں مرے سائے سے دور رہتا ہے
کہ جیسے کاٹ ہی کھائے گی مفلسی میری

ایک اصطلاع کا سہارا لے کر انہوں نے یہ شکایت کی تھی ؏

یہاں اہلِ سخن کی قدر بعد از مرگ ہوتی ہے
یہاں ہر ایک دعویٰ خارج المیعاد ہوتا ہے

حکومت کی عدالت میں ان کی دادرسی ہوئی اور ایک مختصر رقم بطور وظیفہ حسب قاعدہ پہلے صرف ایک سال کیلئے منظور ہوئی تو جناب شوقؔ یوں چیں بہ جبیں ہوئے تھے کہ "کیا ایک سال ہے دی معیادِ زندگی؟ان کی معیادِ زندگی بہر حال ایک سال

میں ہی ختم ہو گئی۔ انہیں دیکھے اور سنے آج کم از کم چار دہائیاں گذر چکی ہیں۔ جناب شوقؔ کا سراپا اور ان کا انہیں کے منھ سے سنا ہوا کلام پھر بھی ذہن و دل کی کتاب میں محفوظ ہے، کچھ اوراق الٹتا ہوں۔

۱۹۵۲ء میں آنجہانی راجندرؔ پرشاد عرف راجنؔ بابو اپنی دیہی صفات کی شہرت کے ساتھ آزاد ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ منتخب ہوتے ہیں تو جناب شوقؔ نے ایک بہت چھوٹی بحر گڑھ کر اس کا نام ''بحر شیر خوار'' رکھتے ہیں اور اس انقلاب وقت پر یوں تبصرہ کرتے ہیں کہ ع

پُر بہار ارے واہ خار زار ارے واہ
کرسیٔ ناز پر اک گنوار ارے واہ

کچھ عرصہ بعد ادھر سرحد پار ملک فیروز خاں نونؔ پاکستان کی وزارت عظمیٰ کی کرسی پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو جناب شوقؔ نے ان کے نام کے ہم معنی انگریزی الفاظ کا فائدہ اٹھا کر یوں چوٹ کرتے ہیں کہ ع

نونؔ کے دور میں یہ تاریکی
آفٹر نونؔ جانے کیا ہو گا

سرحد کے دونوں طرف بڑھتی ہوئی بدعنوانیوں سے نالاں ہو کر جناب شوقؔ مختلف عنوانوں سے یوں کف افسوس ملتے ہیں کہ ؎

عدالت کو بھی اب لبھانے لگی ہے
مسماۃ رشوت کی اٹھتی جوانی

پہونچنا بام ترقی پہ کچھ نہیں مشکل
اسمبلی میں کوئی رشتے دار ہو تو سہی

جو وقتِ پرسش کوئی بھی بگڑا فرشتہ موت ہنس کے بولا
یہ بابو جی حشر کا میداں تمہارا ہندوستاں نہیں ہے

ایک دفعہ گورکھپور کے ایک مشاعرے میں ایک مولوی نما ناظم مجلس قطعاً بے جا طور پر شوقؔ صاحب کیلئے کچھ گستاخانہ جملے کہتے ہیں تو برافروختہ ہو کر انھوں نے بھی فی البدیہہ حملہ کرتے ہیں اور پوری مولوی قوم کو نعوذ باللہ یوں نشانہ بناتے ہیں ؎

عقل کے کچھ دبیر ہوتے ہیں
ہم نے دیکھا ہے دہر میں اے شوقؔ
ایک مہمل سی چیز ہوتے ہیں

مولوی بد تمیز ہوتے ہیں

اور پھر ایک طویل غزل میں یوں وشنام طراز نظر آتے ہیں ؎

ہو تم بھی ابنِ آدم اور وہ بھی بنتِ حوا ہیں
یہ ہم بھی مانتے ہیں واجب التعظیم ہیں واعظ
مری بیوی تمہیں کہنے لگی بھائی تو کیا ہو گا؟
مگر چندیا جو ان کی آپ کھجلائی تو کیا ہو گا
چلے تو ہو کسی محمل نشیں کو دیکھنے زاہد
مگر لیلیٰ کی کتیا تم پہ غرّائی تو کیا ہو گا

اب دوسری طرف چلئے اور دیکھئے کہ جناب شوؔق کسی انتہائی سنجیدہ مصرعے کو حسبِ روایت بار بار دہرا کر اچانک اس پر دوسرا قطعی غیر متوقع ظریفانہ مصرع چسپاں کرکے کس طرح محفل کو قہقہوں سے لالہ زار کرتے ہیں۔ غزل کے پیکر میں اس انداز کے ذرا ان کے چند اشعار دیکھئے ؎

یہ کون آ کے تصوّر میں میرے بیٹھ گیا
خدا کی مار ہو انگلی کچل گئی میری

خوشی کو غم حیات کو ممات کہتے آئے ہیں
ہر ایک بات آپ واہیات کہتے ہیں

اور پھر ذرا یہ رنگ بھی دیکھئے۔ایک نعتیہ مشاعرے میں جناب شوقؔ سامعین میں نظر آتے ہیں تو کچھ دوست نما دشمن انہیں گھیر کرا سٹیج پر لے آتے ہیں اور اپنے مخصوص رنگ میں مگر موقعہ کے شعر سنانے کی فرمائش کی۔ چیلنج قبول کرتے ہوئے وہ یوں گرجتے ہیں کہ ع

میں گھس جاؤں کا جنت میں خدا سے بس یہی کہہ کر
یہیں سے آئے تھے آدم یہ میرے باپ کا گھر ہے
ہبل کو آج کعبے سے نکالا ہے یہ فرما کر
یہ بیتِ کبریا ہے بے کہ تیرے باپ کا گھر ہے

پھر محرم کے دنوں میں شوقؔ صاحب کا مسلک انہیں ایک ماتمی مجلس میں لے جاتا ہے تو وہاں اپنے مخصوص رنگ میں عم امام معصوم حضرت کے عمزادہ حسینؓ حضرت عباسؓ علمبر دار (غیر معصوم) کا رشتہ امام مظلوم کے صاحبزادے جوڑ کر ان کی شان میں یہ نے ضرر اور معنی خیز شعر سناتے ہیں ع

عباسؔ کی بزرگی زین العباؔ سے پوچھو
معصوم تو نہیں ہے معصوم کا چچا ہے

افسوس کہ ہر رنگ میں اپنا رنگ دیکھانے والا 'دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے والا'' روتوں کو ہنسانے والا' طنز و ظرافت کے نشتر سے امراضِ معاشرہ کی تشخیص کرنے والا یہ بے مثال فنکار گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔ کاش کوئی محقق 'اردو کا کوئی جیالا' اس کے فن کو زندہ کر کے اردو والوں سے اس کے فن کا خاطر خواہ تعارف کرواس کے تو یقیناً علم و ادب کی ایک بڑی خدمت ہو گی۔

بابا جمالؔ کی یاد میں[2]

بابا جمالؔ بہرائچی کا ذکر ہمیں کشاں کشاں بچپن کی یادوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کی شبیہ آج اتنے عرصے بعد بھی ذہن و دل میں محفوظ ہے۔ وہ اور ہمارے والد مرحوم تقریباً ہم عمر تھے اور دونوں ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے۔ بہرائچ میں ہماری کوٹھی کے بیرونی صحن یا ڈرائنگ روم میں گاہے بہ گاہے شعری نشستیں ہوا کرتی تھیں جن میں اکثر بابا بھی شریک ہوتے تھے۔ وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ان کی ایک دکان تھی جہاں کتابیں بھی دستیاب ہوتی تھیں اور کچھ اور اشیاء بھی۔ ہم اپنے بھائیوں کے ساتھ کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ ہمیشہ بزرگانہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ بابا غالباً فن طب سے قدرے واقف تھے اور انھوں نے کوئی خاص تیل بنایا تھا جس کی نسبت سے والد مرحوم کے ملازمین ان کے نام کے ساتھ اکثر "تیل والے" کا اضافہ کیا کرتے تھے۔ یہ بھی یاد آتا ہے کہ انھیں کسی قانونی الجھن کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس سلسلے میں ہمارے والد بزرگوار نے ان کی قانونی رہنمائی فرمائی تھی۔ شعر و شاعری کا

[2] مولانا جمال الدین احمد بابا جمالؔ بہرائچی کے زیر طبع مجموعہ کلام "صدائے وطن" کے لئے لکھا گیا وہاں سے نقل ہے۔

شوق ہمیں بچپن سے تھا اور کچھ ہم جماعت باقاعدہ شاعر تھے جن میں ساغرؔ مہدی، اظہارؔ وارثی اور نذر الحسنین شامل تھے جن کے ساتھ بھی بابا کی خدمت میں حاضری ہو جاتی تھی۔ نذر الحسنین کو تو شائد بعد میں ان سے باقاعدہ تلمذ کا شرف حاصل ہو اتھا اور شاید اسی نسبت سے انھوں نے آگے چل کر شاعرؔ جمالی تخلص اختیار کیا تھا۔ بہرائچ کے چند باذوق احباب بابا کی حیات اور شاعری پر جو کام کرنے جارہے یہ ان پر بابا کا قرض ہے جس کیلئے وہ اجر عظیم کے حقدار ہیں۔

بھولا بسرا مترنم سخنور شفیقؔ بریلوی[3]

(۱)

شہر میں چھوٹے بڑے سب انھیں بڑے احترام سے ’’ماسٹر صاحب‘‘ کہتے تھے۔ وہ تھے تو ایک مقبول اسکول ٹیچر لیکن انکی اصل پہچان انکی اردو شاعری اور خوش الحانی تھی۔ ہمارے بچپن کا زمانہ تھا مگر کچی عمر میں بھی ہمیں اردو خوب آتی تھی اور ادبی نشستوں میں بڑی دلچسپی سے شریک ہوتے تھے۔ جس شاعر کا کلام اور ترنم دل پر چھا گیا اسکے دلدادہ ہو جایا کرتے تھے اور یہی ہمارے اور ماسٹر صاحب کے تعلق کی شروعات تھی جو بہرائچ میں ہمارے آبائی مکان سے تھوڑی دور پر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ اس شہر میں کب اور کیوں آئے تھے لیکن بہرحال اصلاً وہاں کے تو نہیں تھے کیونکہ اپنے تخلص ’’شفیق‘‘ کے ساتھ ’’بریلوی‘‘ لکھتے تھے۔ ماسٹر صاحب کا اصلی نام محمد سعید خاں تھا اور لوگ انھیں عام طور سے اسی نام سے جانتے تھے۔ بچپن ہی میں انگریزی اور اردو میں ہمارے مضامین اسکول کی میگزین میں شائع ہونے لگے تھے جنکی بدولت ہمارے سبھی استاد ہمیں بہت پسند کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب ہمارے استاد تو کبھی

---

[3] یہ مضمون ’’ہم دشت میں دیتے ہیں اذاں‘ مطبوعہ ۲۰۱۱ء سے نقل کیا گیا ہے۔

نہیں رہے مگر حوصلہ افزائی ہماری وہ بھی کرتے رہتے تھے۔ کم عمری میں ہم نے اپنی تندرست و توانا ماں کے دنیا سے اچانک رخصت ہو جانے کا صدمہ اٹھایا تو دل کا زخم ایک ٹوٹی پھوٹی نظم کی شکل میں زبان پر آگیا۔ سبھی حیران تھے کہ اس عمر میں ہم ایسے اشعار کیسے کہہ سکتے تھے اور سب کا خیال تھا کہ اسکے پیچھے ہمارے ان محترم قدردانوں میں سے کسی کی عنایت رہی ہو گی۔ کچھ عرصہ بعد جب ہم نے کچھ اور بچکانہ اشعار کہے تو انھیں سنکر ہمارے والد مرحوم و مغفور نے جو ہماری زندگی کا ہر چھوٹا بڑا فیصلہ فرمایا کرتے تھے ہمیں طبع آزمائی کی اجازت دی اور حکم دیا کہ ’’کہنا چاہتے ہو تو سعید سے اصلاح لے لیا کرو‘‘۔ تعمیل ارشاد میں جلد ہی ہم اپنی ایک طفلانہ تخلیق لے کر ماسٹر صاحب کے پاس پہنچے تو انھوں نے ہمیں خالی ہاتھ ٹرخا دیا۔ چنانچہ مجوزہ رشتہ تلمذ تو قائم نہ ہو سکا مگر ان سے ہماری عقیدت میں کمی نہیں آئی۔ کمسنی کی معصوم تخلیقات کی اصلاح کیلئے بہرحال ہمیں کہنہ مشق شاعر وقت جناب ریاست حسین شوقؔ بہرائچی مرحوم کی شکل میں نعم البدل مل گیا تھا۔

ایک عرصہ بعد جب ہم لکھنؤ میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور ہر چھوٹی بڑی چھٹی میں گھر بھاگ جایا کرتے تھے ہمیں ماسٹر صاحب سے قربت کا موقع ملا۔ وہ اس وقت آزاد کالج کے نام سے معروف شہر کے واحد مسلم اسکول کے پرنسپل تھے جسکی انتظامیہ کمیٹی کے صدر ہمارے والد مرحوم تھے۔ ماسٹر صاحب

تقریباً روز ہی ہمارے گھر آتے تھے اور اسکولی کاموں کے علاوہ شعر و شاعری بھی ہوتی رہتی تھی۔ کلام تو اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہی تھا انکی خوش الحانی بھی سبھی کو مسحور کرتی تھی اور ہم تو انکے صف اوّل کے عقید تمندوں میں شامل تھے۔

ایک بار ماسٹر صاحب نے ہمیں انھیں دنوں کا ایک دلچسپ واقعہ سنایا تھا۔ ہمارے والد مرحوم کے ایک محرر تھے منشی محمد شاہ جو ادبی ذوق رکھتے تھے اور اپنے گھر پر شعری نشستیں کیا کرتے تھے جن میں انکی شریک حیات شفیق النسا بھی جنھیں منشی جی ''شفیقُن'' کہا کرتے تھے دلچسپی لیتی تھیں۔ ایسی ہی ایک نشست میں ماسٹر صاحب نے اپنے مقطع کا پہلا مصرع ''شفیقؔ آنکی محفل میں آتو گئے ہو'' پڑھا اور والد صاحب نے از راہ مذاق برجستہ کہا ''واہ کیا مصرع کہا ہے شفیقُن کی محفل میں آتو گئے ہو'' تو محفل قہقہوں سے لالہ زار ہوگئی اور ماسٹر صاحب کا دوسرا مصرع اس میں دب کر رہ گیا۔

(۲)

تعلیم ختم کرکے ہم نے جونپور کے ایک کالج میں پہلی ملازمت کی تو چند ماہ بعد حسن اتفاق سے ماسٹر صاحب بھی مقامی محمد حسین انٹر کالج کے پرنسپل بن کر آگئے اور ابتدا میں ہمارے ہی مہمان رہے۔ قریب ایک سال ہم دونوں اس شہر میں رہے اور اس درمیان ایک دومنزلہ مکان میں کبھی ہم اوپری اور وہ نچلی منزل

میں مقیم رہے اور کبھی یہ ترتیب پلٹ گئی۔ ہم نے تو آئندہ سال علی گڑھ کی راہ لی مگر ماسٹر صاحب جونپور ہی میں رہے اور شاید وہیں سے سبکدوش ہوئے۔ جب وہ بہرائچ کا آزاد کالج چھوڑ کر جونپور منتقل ہو رہے تھے تو وہاں ایک الوداعی جلسہ میں کالج کے استاد اور مقبول شاعر ساغرؔ مہدی نے ایک بڑی جذباتی نظم پڑھی تھی جسکا ماسٹر صاحب سے جونپور میں سنا ہوا یہ شعر ہماری یادداشت میں اب تک محفوظ ہے:

نہ روک پائے آپ کو یہ واقعہ عجیب ہے
مری غریب درسگاہ کس قدر غریب ہے

بہرائچ میں ان دنوں ایک غیر مسلم شاعر تھے جو "پریم" تخلص کے ساتھ اردو پر مشق ستم فرمایا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی اس موقع پر ماسٹر صاحب کیلئے ایک الوداعی نظم سنائی تھی جسکا یہ دلچسپ شعر بھی ماسٹر صاحب نے ہمیں سنایا تھا:

یہ ہمارے خاص تھے اور خاص خاص الخاص تھے
اس لئے اس پریمؔ کا دل خاص کر خاموش ہے

ہماری اسکول کی طالب علمی کے زمانہ میں ماسٹر صاحب کی ایک طویل بحر کی غزل زباں زد عام تھی جسکے دو مخصوص مصرعے ہمارے ہم سبق اکثر استعمال کرتے تھے۔ "پیئے کون کس کو پلانے کی فرصت نہ ہم غم سے خالی نہ تم غم سے

خالی "زیادہ ملاقات نہ ہونے کے شاکی دوستوں کو سنایا جاتا تھا اور "یہ تھا احترام محبت کہ ہم نے نظر احتیاطاً نظر سے بچالی" کا مصرع نازک رومانی موقعوں پر کام آتا تھا۔

(۳)

ماسٹر صاحب کے بے شمار اشعار عصری مسائل پر ہوتے تھے جنکی توجیہ کرتے ہوئے انھوں نے ایک بار کہا تھا:

کہیں شاعری کے شانہ سے شفیق اُلجھ نہ جایں
کہ عروس عصر نو کے خم زلف ہیں مدلل

خود ہمیں ماسٹر صاحب کا ایک قطعہ بے حد پسند تھا اور آج پیچھے پلٹ کر اپنی گذری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو انکے اس تجربہ میں خود کو حین حیاتی شریک پاتے ہیں:

فسانے سنے بے غرض دوستی کے
تجربے کئے بے سبب دشمنی کے
لبادوں میں لپٹے ہوئے دوستی کے
ہیں دشمن بہت آدمی آدمی کے

ماسٹر صاحب ذاتی طور پر مجسم عجز وانکسار تھے اور اسکی جھلک انکے کچھ اشعار میں بھی ملتی تھی۔ اردو کے عظیم شاعر شفیقؔ جونپوری راہی ملک عدم ہوئے تو ہم دونوں جونپور ہی میں تھے اور ایک تعزیتی نشست میں ماسٹر صاحب نے یہ شعر پڑھا تھا:

شفیقؔ جونپوری کی میں خاک پا بھی نہیں
شفیقؔ نام ہی رکھنا بڑی جسارت ہے

ماسٹر صاحب کا اپنا ترنم تولا جواب تھا مگر پھر بھی انھوں نے کلام سے زیادہ طرز پر نظر رکھنے کی لوگوں کی روش پر یوں اظہار ناپسندیدگی کیا تھا:

یہ عجیب فیصلہ ہے مرے ناقدان فن کا
مری لے نہیں جو عامی مرا فن نہیں عوامی

(۴)

یوں تو ماسٹر صاحب کی نہ جانے کتنی حسین و جمیل تخلیقات ہمارے ذہن کے خانوں میں محفوظ ہیں مگر ہم ہی نہیں انکا ہر سننے والا سب سے زیادہ ''حاجی سے خطاب'' نامی ان کی ایک نہایت خوبصورت اور سبق آموز نعت سے مسحور ہوتا تھا جس کے کچھ اشعار یوں ہیں:

جلال مہرو جمال قمر سے کیا لائے
مرے رفیق کہو اس سفر سے کیا لائے
حیات و موت کے جس نے بدل دئے معنی
تم اس حکیم سے اس دیدہ ور سے کیا لائے
وہی مدینہ جہاں ہمتیں جوان ہوئیں
تم اس مدینہ کے قلب و جگر سے کیا لائے
غروب کفر بھی ہے جو طلوع ایماں بھی
تم اس مدینہ کے شام و سحر سے کیا لائے
جہاں پہ جنّ و ملائک نے پاسبانی کی
اس آستا نۂ خیر ا لبشر سے کیا لائے
گداز قلب شعور نظر خلو ص عمل
جو یہ نہ لائے تو پھر اس سفر سے کیا لائے
محبتوں کے خزانے اخوتوں کے گہر
نہ لائے یہ توشہ بحر و بر سے کیا لائے
شفیقؔ تم تو ہو نا آشنائے ناز و نیاز
بتایں کیسے تمھیں انکے در سے کیا لائے

(۵)

ماسٹر صاحب سے ہماری آخری ملاقات جنوری 1997 میں ہوئی تھی جب ہم نے بہ حیثیت صدر قومی اقلیتی کمیشن اپنے آبائی شہر کا دورہ کیا تھا۔ وہ صاحب فراش تھے اور ہم نے انکے پاس حاضر ہونا چاہا تھا مگر انکے اصرار پر اپنی سرکاری گاڑی بھیج کر انھیں غریب خانہ تک آنے کی زحمت دی تھی۔ ہم دونوں ہی اس دن نہ جانے کتنی دیر تک ماضی کی یادوں میں کھوئے اور ساتھ گذارے وقت کو یاد کرتے رہے تھے۔ اسکے کچھ ہی عرصہ بعد ماسٹر صاحب چلے گئے، وہاں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

ہمدمِ دیرینہ اظہارؔ وارثی

(موصوف کے زیر طبع مجموعہ کلام کیلئے پیش لفظ 1999)[4]

اب سے چالیس سال سے بھی زائد عرصہ پہلے جب کہ میں اپنے آبائی وطن بہرائچ کے سب سے باوقار تعلیمی مرکز گورنمنٹ اسکول میں زیر تعلیم تھااور اوائل عمر کا اولی ذوق نا اہلوں کے ہجوم میں کسی ہم مذاق اور ہم خیال کا متلاشی رہتا تھا، ایک ہم جماعت ملے اور دل و دماغ پر چھاگئے۔ ایک دن دیر رات گئے ایک شعری نشست میں بہ حیثیت سامعین شرکت کے لئے جاتے ہوئے تاخیر سے بچنے کے لئے ہم دونوں ہم جماعتوں نے اپنی سائیکلیں ایک کھیت کی پگڈنڈی پر اتار دیں اور میرے ہم سفر نے بے ساختہ یہ مصرع پڑھا''بحر ظلمات میں دوڑادیئے گھوڑے ہم نے'' یہ شروعات تھی میری دوستی کی آج کی اس معروف ادبی شخصیت سے جسے دنیائے سخن حضرت اظہارؔ وارثی کے نام سے جانتی ہے۔ یہ دوستی وطن آبائی میں میرے چند سالہ قیام کے دوران برابر قائم رہی۔ شہر میں وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں ہم دونوں اکثر ایک ساتھ شرکت اور ان پر تبادلہ خیال کی جرأت کرتے رہتے۔ کبھی کبھی چند اور ہم مذاق طلبہ بھی ہماری محفلوں میں شریک ہوتے

---

4 زیر نظر مضمون اظہارؔ وارثی صاحب کے ایک غیر مطبوعہ مجموعہ ''لو مرے چراغ کی'' کے لئے لکھا گیا تھا۔ جو شائع نہیں ہو سکا۔ یہ مضمون ''جرأت رندانہ'' مطبوعہ ۲۰۰۱ء میں شامل اشاعت ہے وہاں سے اس کو نقل کیا گیا ہے۔

اور اظہارؔ صاحب اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں انہیں خوش آمدید کہتے۔ ایک بار ایک نو وارد جو بہ اعتبار ملازمت ملیریا انسپکٹر تھے اپنے ایک ہم دفتر کے ساتھ شریک محفل ہوئے تو اظہار صاحب نے ایک مصنوعی آہ سرد بھر کر کہا کہ ؏

پیدا ہوئے ہیں اب تو مسیحا نئے نئے

بیمار اپنی موت سے پہلے ہی مر نہ جائے

اظہارؔ صاحب مجھے ایک مخلص دوست اور اخلاق و مروت کا پیکر ہی لگے اور ہمیشہ ابصد وضعداری وہی لگتے رہے۔ بزم شعر و ادب کے کہ یہ مشق استاد حضرت صفدر صفاؔ نبیرہ اور شہر وفا کی روایات کے معتبر امین حکیم اظہرؔ وارثی کا لخت جگر ظاہر ہے کہ اور کچھ لگ بھی کیسے سکتا تھا۔

اسکول کی تعلیم کے دن کسی ڈرامے کے ایک مختصر سین کی طرح جلد ختم ہو گئے اور ہم دونوں دارورسن کے اصلی ''بحر ظلمات'' میں اپنے اپنے گھوڑے الگ الگ دوڑانے کے لئے بچھڑ گئے۔ اب کبھی کبھار اگر وطن آبائی کے مختصر قیام کے دوران اُن سے ملاقات ہو جاتی تو ہم دونوں کچھ دیر کے لئے ''گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را'' پر عمل کر لیتے۔ آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ ایک طویل عرصے تک ''رہیں ستم ہائے روزگار'' ہو کر ہم دونوں ایک دوسرے کے ''خیال سے غافل'' ہی رہے۔ تا آنکہ ۱۹۹۷ء کے اوائل میں اظہارؔ صاحب نے

میری اسکول کے زمانہ کی ایک تصویر جو اُن کے پاس محفوظ تھی پشت پر یہ شعر لکھ کرڈاک سے مجھے ارسال کی ؎

بھیجیں کیسے اُن کو بھی ہم تیری اِس تصویر کے ساتھ
یادیں جو منسوب ہیں ہمدم تیری اِس تصویر کے ساتھ

اُسی زمانہ میں سرکاری دورہ پر بہرائچ جانا ہوا اور خبر سُن کر اظہارؔ صاحب آکر فرطِ محبت سے بغل گیر ہوئے تو یہ "ہمدم دیرینہ کا ملنا" مجھے واقعتا" ملاقات مسیحا وخضر سے بہتر "ہی لگا۔

اِس سال ۱۷/اکتوبر کو جو کہ اتفاقاً مگر معنی خیز طور پر "یوم سرسید" تھا، اظہارؔ صاحب نے سات اصناف سخن پر مشتمل اپنی زیر طباعت کتاب "لو مرے چراغ کی" سے ماخوذ اشعار کا ایک مختصر انتخاب مجھے بھیجا تو اُس کے ایک ایک شعر نے میرے دل و دماغ کو لغوی معنوں میں جھنجھوڑ دیا۔ موقّر اطبأ کے خاندان کے اس چشم و چراغ نے ایک پختہ مشق نباض وقت کی طرح انسانیت کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے اور حالات حاضرہ کے تکلیف دہ منظر نامے کے دریا کو اشعار کے کوزے میں پر کر دیا ہے۔ غالبؔ اعظم کی زمین میں اُن کا یہ شعر گویا اپنی کتاب کا خود ان کی طرف سے تعارف ہے کہ ؎

اِک ورق مہتاب ہے تو اک ورق ہے آفتاب
اِس کتابی روئے عالم تاب کی تغییر کا

میں اپنے صدیق عزیز کے خود ان کی طرف سے ان کے اس بھر پور تعارف صادق پر صرف ’’آمناو صدقنا‘‘ ہی کہہ سکتا ہوں۔ ’’لو مرے چراغ کی‘‘ کے نہ جانے کتنے اشعار میں مجھے خود اپنے کرب دل کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ شد بد میدانِ سخن میں مجھے بھی ہے، اگر چہ یقینا کلام اظہار کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ ’’خاک کو آسماں سے کیانسبت‘‘ بچپن کے ہم جماعت دیکھئے آگے چل کر کس کس طرح ہم خیالی اور مختلف الخیالی دونوں کے بیک وقت حامل ہو سکتے ہیں۔ اظہارؔ صاحب کہتے ہیں کہ ؎

جور پیہم کا محبت لطف تڑپانے کا نام
وضعداری ہے قریب دوستی کھانے کا نام
سونپ کر خاموشیوں کو دل کی بیتابی کا حال
مصلحت رکھا ہے ہم نے اپنے افسانے کا نام

اور فیضؔ کی اسی زمین میں میں نے عرض کیا ہے کہ ؎

طنز اور تشنیع کے تیروں کو سہ جانے کا نام
خدمت ملتی ہے یارو گالیاں کھانے کا نام
ہضم کرنا سچ کی کڑواہٹ بہت مشکل سہی
صرف حق گوئی ہے پھر بھی میرے افسانے کا نام

دل کے درد کو اظہارؔ صاحب نے ان الفاظ کا جامہ پہنایا ہے کہ ع

کڑوے شہد آواز میں اپنی کب تک یوں ہی گھولو گے
بدلو گے کب ڈھنگ اپنا کب میٹھی بولی بولو گے
اپنے اندر اپنے ہی بھگوان بنے رہ جاؤ گے
من مندر کے دوار نہ جب تک اوروں پر تم کھولو گے

اور بر دران وطن سے میں نے یوں اپیل کی ہے کہ ع

نفرتوں کا یوں تو میلا مت کرو
دھرم کا ایسا جھمیلا مت کرو
بول رامائن کے میٹھے ہیں انہیں
تلخ گوئی سے کسیلا مت کرو

اپنے تعارف میں اظہارؔ صاحب فرماتے ہیں کہ ع

بے تابیوں کو سارے جہاں کی سمیٹ کر
جس میں چنا گیا تھا وہ دیوار میں ہی تھا

اور میں نے یہ کہنے کی جرات کی ہے کہ ع

انصاف اپنی جنگ ہے حق گوئی اپنی سلطنت
سوز و گداز قلب پر ہی اس ہماری ملکیت

چلئے چھوڑیئے اس ناحق موازنہ کو کہ بچپین کی ہم جماعتی کے سہارے میری طفلانہ جرأت بن کلام اظہارؔ کی بلوغت سے موازنہ کی حقدار نہیں بن سکتی۔ ہاں اظہارؔ صاحب کا یہ لافانی شعر میری اور ان کی دوستی پر ضرور صادق آتا ہے کہ ؂

سلسلے دل سے تیری یادوں کے

رفتہ جسم و جاں سے لگتے ہیں

مدتوں بعد اظہارؔ صاحب کو اظہار صاحب کیلئے ان کے ۱۷ اکتوبر کے مکتوب کے تعلق سے کچھ لکھا ہے تو اس بے وقعت تحریر کو ان ہی ان مصرعوں پر ختم کرتا ہوں کہ ؂

آج خط کا جواب لکھ دیں گے

اُس نے لکھا ہے حال دل لکھو

زخم دل کو گلاب لکھ دیں گے

منظوم خراج عقیدت

(۱)

مری حیات کا ہر پل عطائے بہرائچ
مرے دکھوں کا مداوا دوائے بہرائچ
اودھ کی شام بنارس کی صبح ہو صدقے
کہ اک جہاں سے جدا ہے ادائے بہرائچ
قُدومِ سیّد سالارؒ کا خزینہ ہے
ہے نور حق سے منوّر فضائے بہرائچ
ہے علم و فن کی روایات کا امیں یہ شہر
ادب نواز ہے یارو ہوائے بہرائچ
یہ شہر الفت باہم کا درس دیتا ہے
مروّتوں کے سبق بھی سکھائے بہرائچ
حیات بخش فضایں ہوایں پاکیزہ
ہے پاس وضع کا گڑھ آبنائے بہرائچ
میں راجدھانی میں رہ کر وہیں تو سوتا ہوں
ہے روز لوری سناتی نوائے بہرائچ

(۲)

وطن سے جب کوئی اچھی خبر آکر سناتا ہے
تو پہروں تک دل ناداں خوشی کے گیت گاتا ہے
وہ گھنٹہ گھر کی شوکت اور وہ درگاہ کی عظمت
نظر میں میری اکثر ہی یہ منظر گھوم جاتا ہے
لڑکپن جن میں گزرا ہے وہ گلیاں یاد آتی ہیں
بڑی حسرت سے لب پر ذکر بہرائچ کا آتا ہے

(۳)

علم کا خزینہ ہے سرزمین بہرائچ
فضل کا نگینہ ہے سرزمین بہرائچ
حسن ساری دنیا کا اس کے حسن پر قرباں
ایسا آبگینہ ہے سرزمین بہرائچ
صورتیں یہاں کیا کیا خاک میں ہیں خوابیدہ
علم کا دفینہ ہے سرزمین بہرائچ
علم کے سمندر میں خوشہ چینی کرنے کو
گویا ایک سفینہ ہے سرزمین بہرائچ
کسب علم کے جذبے آکے یاں نکھرتے ہیں
بام فن کا زینہ ہے سرزمین بہرائچ
زندگی نبھانے کے گر بھی یہ سکھاتی ہے
جینے کا قرینہ ہے سرزمین بہرائچ

(۴)

نہ اب بزرگوں کا نام و نشان باقی ہے
نہ ان کی بزم کی وہ آن بان باقی ہے
خزاں رسیدہ ہیں گھر کے سبھی در و دیوار
نہ باغ ہے نہ کوئی باغبان باقی ہے
نہ اب شفیق نہ ہمدم نہ غمگسار کوئی
مکیں چلے گئے خالی مکان باقی ہے
جہاں پہ بیٹھ کے بچپن میں گیت گائے تھے
نہ وہ صحن نہ کوئی سائبان باقی ہے
وطن عزیز ہے ہمّت نہیں ہے جانے کی
نہ اب وہ گھر نہ کہیں خاندان باقی ہے

(۵)

بچپن کے تھے تینوں یار، ساغرؔ، شاعرؔ اوراظہارؔ
ادب کے رسیا ہم بھی تھے اور ہم کو تھا تینوں سے پیار
آپس میں مل بیٹھ کے چاروں اکثر باتیں کرتے تھے
ہنستے گاتے ساتھ میں رہتے اور سناتے سب اشعار
گہری رفاقت کا افسانہ شہر میں تھا خاصا معروف
خوب سراہے جاتے تھے اس کے چاروں ہی کردار
تھی سب پر اللہ کی رحمت اور بزرگوں کا سایہ
جنکی شفقت سے رہتا تھا چمن ہمارا باغ و بہار
ایک اک کرکے تینوں بچھڑے یادوں میں پر زندہ ہیں
خوابوں میں ہم سے کرتے ہیں اب بھی یہ باتیں بسیار

(۶)

نیپال کی سرحد پہ وہ اک بزم مزین
وہ شہر اودھ حضرت مسعودؒ کا مدفن
درگاہوں کا تکیوں کا مساجد کا وہ گلشن
ارواح سعیدہ کے مزارات کا مسکن
الفت کا محبت کا رواداری کا مخزن
صدیوں سے بغل گیر جہاں شیخ و برہمن
اس شہر کے اک گوشے میں وہ اپنا نشیمن
اس کے در و دیوار وہ دالان وہ آنگن
خوشبو سے مہکتے ہوئے کمروں کی سجاوٹ
دروازوں پہ آویزاں وہ تہذیب کی چلمن
وہ نور میں ملبوس بزرگوں کی نمازیں
شفقت بھرے لہجوں کا برستا ہوا ساون
یادوں کے جھروکوں میں سجا آج تلک ہے
آغوش میں اس گھر کی گزارا ہوا بچپن



الاحسان اکیڈمی بہرائچ

بہ یادگار: حضرت مولانا محمد احسان الحق قدس سرہ العزیز
مہتمم اول جامعہ مسعودیہ نور العلوم بہرائچ

الاحسان اکیڈمی بہرائچ ایک تحقیقی تصنیفی ادارہ ہے۔ جس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں۔

۱: نسل کو اکابر و شخصیات بہرائچ سے متعارف کرانا۔

۲: شخصیات بہرائچ کی سوانح حیات پر علمی و تحقیقی کام انجام دینا۔

۳: اہم علمی نوادرات، مختلف موضوعات پر اکابر (خصوصا اکابرِ بہرائچ) کے ذریعے لکھی گئی قدیم کتب کی جدید اشاعت کرنا۔

۴: اکابر کی اہم علمی و تحقیقی کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرانا۔

اکیڈمی اپنی خدمات اور سرگرمیاں انٹرنیٹ کی وساطت سے متعارف کرانے کا بھی نظم کرے گی۔

رفقائے اکیڈمی

جنید احمد نور ☆ کلیم احمد قاسمی ☆ وصی اللہ قاسمی

/ Alihsanbahraich

/ Alehsaanbahraich